

بشری علم الدین
ڈاکٹر طاہرہ اقبال

گلزار کی شاعری میں ہجرت کا المیہ

Migration tragedy in Gulzar's poetry

By Bushra Ilmuddin, PhD scholar, Department of Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad.

Dr. Tahira Iqbal, Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad.

ABSTRACT

Indo-Pak subcontinent has been victimised by revolutionary and geopolitical challenges since 1947. Due to these factors trends and thinking philosophy of writers and poets has been influenced. Poetry always reflects the deep sentiments which is related to human nature and psychology. Urdu Literature is also rich with novel and different topics specially based on Migration, community problems and religious integrity. Gulzar as a sensitive legendary person also effected by all these tragic and painful migrations. He produced marvellous piece of work in poetry and prose. He is versatile and has realistic approach to narrate the realities. He by himself faced the disturbance and lawlessness which he transformed in his writings. He prevailed his deep personal feelings during the partition in shape of ruthless loss of lives. Communal riots and terrorism forced a large number of religious communities to leave their native homes and properties and suffer countless difficulties. In following article researcher highlighted Gulzar's work in this regard.

Keywords: Migration, Religion, Gulzar, Literature, Changes, Human philosophy, Traditions.

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد
پروفیسر، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

برصغیر پاک و ہند کی سرزمین کم و بیش پچھلی دو صدیوں سے حادثات، انقلابات اور سیاسی و جغرافیائی تغیرات کا مرکز رہی ہے۔ حالات کے بدلنے سے سوچ اور فہم کے انداز کے ساتھ ساتھ موضوعات کے زاویے بھی بدلتے رہے۔ برصغیر کے شعرا نے بھی معاملات دہر اور عصری پیچیدگیوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا لیکن انھیں بھی غم جاناں سے غم دوراں کے سفر میں اُن گنت تبدیلیوں سے واسطہ رہا۔ اردو شاعری ہمیشہ سے اپنے اندر جذبات نگاری، واردات قلبی، خوشبوئے احساس اور تعلقات انسانی کے لطیف پہلو سموئے ہوئے ہے۔ کلاسیکی دور کے بنیادی عنوانات ہوں یا جدید دور کی شاعری کے مختلف مدارج شاعری ہمیشہ زرخیز خصائص اور مقبول رجحانات کی مظہر رہی ہے۔ شاعری کے موضوع اور ادوار وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہے، مگر بنیادی موضوع بقائے حیات انسانی رہا۔ جس پر افلاطون، سقراط، سرفلپ سڈنی، شیکسپئر، ورڈزورٹھ، کیٹس، کارلج، ٹی ایس ایلٹ اور اردو میں امیر خسرو، ولی دکنی، آتش، ناسخ، میر، غالب، اقبال، فیض، مجید امجد، ناصر کاظمی اور احمد ندیم قاسمی سے ہوتی ہوئی یہ روایت گلزار تک پہنچی۔

گلزار ہمہ صفت، ہمہ جہت اور متنوع پرتوں والا ادیب ہے۔ اُن کا عہد فساد و انتشار کے بعد ایک نئی زندگی اور نئے زاویوں کی تلاش کا عہد تھا۔ جہاں ایک جانب ہجرت کی انارکی و فسادات کا سماں اُن کی دور بین نگاہوں کے سامنے تھا تو دوسری جانب مغربی قوموں اور سامراجی نظام کی بدولت ہندوستانی فضا اور معاشرتی زندگی کے پرسکون بہاؤ میں ایک نئی لہر اور نئی سوچ کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ جو معاشرے کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی طرز زیست کی بیداری میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ اردو شاعری میں تقسیم اور ہجرت کا مقامی المیہ آفاقی تخلیقات کا سبب بنا۔ گلزار کا فن بھی مجبوری کی اس بھٹی میں تپتا رہا۔ فسادات اور اس کے نتیجے میں ہونے والے قیامت خیز واقعات کی لرزہ خیز تاریخ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کی نظم و غزل کے تنفس کا مدار بھی اس پر ہے۔ دھرتی سے گہری محبت، زمینی حقائق، رشتوں کی پیچیدگی، سیاسی تناظرات کی عکاسی، ذاتی زندگی کا کرب اور ان سب سے بڑھ کر ہجرت کے صدمے نے انہیں حد درجہ متاثر کیا۔ اس اثر آفرینی کی فضا نے گلزار کی شاعری کے انفرادی تجربے کو جلا بخشی جو خیال و بیان کی جدت آفرینی سے معاشرتی آواز بن گئی۔ اپنے اصل کی تلاش ہر باشعور انسان کو مصروف عمل رکھتی ہے۔ دینے کا حوالہ گلزار کی شاعری میں متعدد مقامات پر منکشف ہوتا ہے۔ یوں اپنی جنم بھومی (دینہ) کی محبت نے اُن کے قلب و ذہن پر انمٹ نقوش مرتب کیے۔

”ہجرت“ اصل میں عربی زبان کے لفظ ہجر سے نکلا ہے جس کے معنی جدائی اور مفارقت کے ہیں۔ یہ ایسا

عمل ہے جس میں کوئی گروہ یا خاندان اپنے آبائی علاقے کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں جہاں ان کے جان و مال کی حفاظت ہو سکے اور وہ اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت بنا کسی خوف کے کر سکے۔ ہجرت ہمیشہ اپنے دامن میں کرب، تکلیف اور مسائل سموائے ہوتی ہے۔ یہ ”ہجرت مدینہ“ ہو یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مصر سے ہجرت، ”ہجرت اندلس“ ہو، غرناطہ سے بغداد تک کی ہجرت یا پھر ۱۹۴۷ء میں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ ساز ہجرت ہو۔ یہ اپنے دامن میں کرب، تکلیف اور مسائل سمو کر لاتی ہے۔

گلزار نے اس المیہ کو نظم ’رفیوجی تھے‘ میں مختصر مگر انتہائی کرب سے بیان کیا ہے:

رات کی رات ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے
رفیوجی تھے.....

آگ دھوئیں اور چیخ پکار کے جنگل سے گزرے تھے سارے
ہم سب کے سب گھوڑوں میں بھاگ رہے تھے
ہاتھ کسی آندھی کی آنتیں پھاڑ رہے تھے
آنکھیں اپنے جبرے کھولے بھونک رہی تھیں^(۱)

فسادات کی وجہ جب لہو اندھیارا مقدر بن جائے تو پھر جاگتی آنکھوں کے خواب ریت کے ذروں کی طرح آنکھوں میں چھتے رہتے ہیں۔ یہ ہجرت، قتل و غارت اور مذہب کی آڑ میں فتنہ گری کا شاخسانہ قرار دی جاسکتی ہے کہ اس لہو فسادات میں جس طرح انسانیت کی تذلیل اور بے توقیری ہوئی اس کی مثال کرۂ ارض پر کہیں نہیں ملتی۔ ہجرت اور فسادات کے المیاتی عناصر کی رُوداد میں گلزار نے جتنی غزلیں، نظمیں اور افسانے رقم کیے ان کا انداز اپنے اندر تیز دھار نشتر اور دائمی دکھ کی فضالیے ہوئے ہے کہ یہ خونچکاں داستان لاکھوں کروڑوں لوگوں کی بے بسی، بے حرمتی اور بربریت کی علامت تھی۔ اس خاک و خون کی داستان الم نے کتنی بستیوں ویران کیں، کتنے آشیانوں کو آگ نکل گئی اور کتنے کڑیل جوان اس بھڑکتی آگ کا نوالہ بن گئے۔ گلزار نے ان حالات کی تصویر کشی ”فسادات“ کے عنوان سے چھ نظموں میں کی۔ ان نظموں میں ان کی خون روتی آنکھیں داستان ہجرت لکھتی ہیں۔ ”فسادات“ کے علاوہ ”دنگے“، ”وراشت“، ”بھمیری“، ”دستک“، ”تاپی“، ”دینہ“، ”نپے ٹلے قدموں سے چلتے چلتے واگھا پر“، ”آنکھوں کو ویزا نہیں لگتا“ اور ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ بھی انھی صدمات اور نشتر کی حامل نظمیں ہیں۔ وہ ان نظموں میں ایسی تصویریں پیش کرتے ہیں کہ جیسے وہ اس کے چشم دید گواہ ہوں۔ ہجرت کی ایسی ہی متحرک تصویر کشی اس نظم میں ہے، کہ جہاں دکھ، بے بسی اور بے چارگی اپنے عروج پر ہے۔

سر پر لو، اور چلو اٹھالو، چھابہ خونچہ اس گاؤں کا
 رشتے ناتے آس پڑوس، اب سب ریڑھی پر رکھو اور لڑھکاؤ ان کو
 جھلی میں ڈالو مٹی پچھلی پشتوں کی، اور ماضی کندھے پر رکھو
 جیب میں بھر لو قبریں اپنی
 ریت رواج اور کلچر و لچر گردن میں لٹکا کے اٹھو
 کمر پہ باندھو ننگے بچے.....
 پیپل تلسی، مڑھی وڑھی، درگا ہیں بیٹھے کنوئیں چلو سب اوندھے کر دو
 کوچ کرو اب! (۲)

گلزار کی شاعری سنگین سماجی حقائق کا شعور اجاگر کرنے کا موجب بن کر ابھرتی ہے۔ وہ انسانی رشتوں، جذبوں اور اُمٹگوں کی ہم آہنگی سے نئی معنویت ابھارتے ہیں۔ جس میں محرومی اور نارسائی کی اذیت اور کشمکش حیات کی فضا ان کی مضطرب و بے قرار روح کو کرب اور ناتمام تمنائوں کے سوز و گداز سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ اسی فہم و فراست اور عصری شعور سے گلزار نے ہمارے سماج کے کرتا دھرتا افراد کے گھناؤنے پن اور ظاہری پاک دامنی کے پردے میں چھپی ستم کاریوں کی نشاندہی نظم ”فسادات“ میں یوں کی ہے۔

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں قتل ہوا
 نام تھے لوگوں کے جو قتل ہوئے
 سر نہیں کاٹا کسی نے بھی کہیں پر کوئی
 لوگوں نے ٹوپیاں کاٹی تھیں جن میں سر تھے
 اور یہ بہتا ہوا سرخ لہو ہے جو سڑک پر
 ذبح ہوتی ہوئی آوازوں کی گردن سے گرا تھا (۳)

مذہب کی آڑ میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کا ایسا بازار گرم ہوا تھا کہ انسانیت سسکتی رہ گئی لیکن المیہ یہ تھا کہ لوگ قتل نہیں ہوئے، بلکہ مذہبی تفریق کے تناسب میں رکھے گئے نام تھے جو صفحہ ہستی سے مٹا دیے گئے اور مذہب کے نام پر اس آگ کی ہولی میں جسم سوکھے خشک تنکے کی مانند اس کا نوالہ بن گئے کہ آگ کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے ہر لحظہ غریب بے بس مظلوم اور سوکھے جسموں کی تلاش رہتی ہے، خواہ اُن کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ برصغیر (پاک و ہند) کے باشندوں پر خوف و ہراس اور مذہبی تفریق کی ایسی فضا مسلط کر دی تھی کہ یہاں کوئی بھی انسان دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ہاتھوں محفوظ نہ تھا۔

گل شیربٹ ہجرت کے حوالے سے گلزار کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہجرت نے انہیں سکھ، ہندو اور مسلمان کا فرق سمجھایا۔ انہیں سپورن سنگھ اور گلزار کا فرق بتایا۔ انہیں مندر اور مسجد میں فرق کی سمجھ آئی۔ انہوں نے سیاست میں مذہب اور مذہبی تعصبات کے بارے میں جانا، انہوں نے جانا کہ تمام عبادت گاہیں کسی ایک خدا کی نہیں اس دنیا میں ہر مذہب کے اپنے اپنے خدا ہیں۔ اور ان خداؤں کے رکھوالے بھی۔ ہجرت کی وجہ سے پیدا ہونے والے حوادث نے انہیں سیاسی فہم و فراست عطا کی۔^(۳)

یہ حقیقت ہے کہ گلزار نے ان دردناک حادثات کے دوران جن تلخ حقائق و واقعات کو محسوس کیا ان کے قلب و ذہن پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے انسان کے بنیادی رشتوں کی بدلتی صورت حال اور انسانی جذبات کی شکست و ریخت نے ادباء و شعراء کو نئی تفہیم سے آشنا کیا۔ برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے تمام رجحانات میں ایک بات جو خاصی اہم ہے کہ اُسے نہ صرف ذہنی و فکری چلا وطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی بلکہ وہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی خوف اور بے بسی کا شکار تھا۔ اس کے خواب خس و خاشاک کی مانند کھھر گئے۔ تخریب کے سخت ترین حملے نے تعمیر کے سارے نقوش دھندلا دیے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

فسادات کے دوران پھوٹنے والی درندگی اور حیوانیت اجتماعی ایذا رسانی کی جبلت کا مظہر تھی۔ تاہم معاشرتی، نفسیاتی، نسلی، تاریخی و تہذیبی یا مذہبی زاویے سے اس واقعہ کی چاہے جتنی بھی تفسیریں پیش کی جائیں اس بات کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں، کہ فسادات نے برصغیر میں بسنے والوں کے امن پسند اور شریف الطبع ہونے کی قلعی کھول دی۔ دوسرے لفظوں میں فسادات کے تحت ہونے والی لوٹ مار، قتل و غارت گری، ایک ایسا چرکا تھا جو جسم سے زیادہ روح کو لگا۔^(۵)

ہجرت نے انسان کے ذہنوں میں انتشار اور ناہمواری پیدا کر دی۔ گلزار کی روح بھی ان واقعات سے زخمی زخمی ہو گئی۔ انہوں نے دہلی میں ہونے والے قتل و غارت بالخصوص روشن باغ میں لاشوں کے ڈھیروں کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھا۔ گلیوں اور بازاروں میں پڑی لاوارث لاشوں سے تعفن پھیلنے لگا، مگر ان کو اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف قاتلوں اور لٹیروں کے ڈیرے تھے۔ لوگوں کو گھروں سے گھسیٹ کر نکالا جاتا، ان پر بے

رحمی سے تلواروں، نیزوں اور بھالوں سے وار کر کے لاشوں کی تذلیل کی جاتی، وہ انسان جو صدیوں سے اکٹھے امن و آشتی کی زیست بسر کر رہے تھے اب حیوانیت کے درجے سے بھی نیچے گر چکے تھے۔ گلزار نے ان واقعات کو ایسے بیان کیا ہے کہ جس میں اُن کا لب و لہجہ واقعہ کی حدت اور منظر کشی میں جان ڈال دیتا ہے۔ گلزار کی شاعری میں جہاں داخلی جذبات کے بیان میں شدت ہے اتنی ہی شدت اور گہرائی سے وہ خارجی ماحول سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس تفصیل کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس تقسیم کے خلاف ہیں بلکہ وہ تکلیف ہے جو حساس ادیب محسوس کرتا ہے۔ ان کے درد کی شدت کو اس خون ریزی کے تناظر میں محسوس کرنا چاہیے۔

معجزہ کوئی بھی اُس شب نہ ہوا

جتنے بھی لوگ تھے اُس روز عبادت گاہ میں

سب کے ہونٹوں پہ دُعا تھی

اور آنکھوں میں چراغاں تھائیں

کہ خدا کا گھر ہے

زلزلے توڑ نہیں سکتے اسے آگ جلا سکتی نہیں

سیکڑوں معجزوں کی سب نے حکایات سنی تھیں

سیکڑوں ناموں سے ان سب نے پکارا اس کو

غیب سے کوئی بھی آواز نہیں آئی کسی کی

نہ خدا کی..... نہ پولس کی!!^(۶)

گلزار نظم ”فسادات“ میں ہونے والے اس ظلم و ستم کو تنقیدی نشانہ بناتے ہیں۔ کہ جہاں فسادِ حریص اور پست ذہنیت کی حامل شیطانیت کی اجارہ داری ہر جگہ قائم تھی۔ انھوں نے اس نظم میں جو پیکر آفرینی کی ہے اُس میں ایک جانب تو خدا کی ذات سے محبت میں گرفتار لوگوں کا یقین کامل تھا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے خدا پر مختلف سوالات اٹھائے۔ تو دوسری جانب ان تمام نہاد آقاؤں یعنی بڑی طاقتوں اور سماج کے اُن مکاتب فکر کی طرف اشارہ ہے جو اس صورت حال کے ذمے دار ہیں کیوں کہ تقسیم میں انسان نے انسان کو نہیں ایک مکتب فکر نے دوسرے مکتب فکر، ایک مذہب نے دوسرے مذہب کو، ایک خدا نے دوسرے خدا کو قتل کیا۔ عبادت گاہوں، مندروں، گردواروں اور کلیسوں میں ہر جگہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کی گردنیں تن سے جدا کر دی گئیں۔ گلزار نے بیانیہ انداز سے نظم کے مفہوم کو گہرائی سے پیش کیا ہے جس سے نظم میں Progression کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔

ان کا لب و لہجہ اصل مدعا و خیال کی کڑیاں ایسے ملاتا ہے کہ اس میں بیانیہ تحلیل ہو کر سامنے آتا ہے۔ جہاں سچائی اور صداقت ہے۔ نظم میں خدا کے پس پردہ معاشرے کے اُن خداؤں کی ذات اقدس کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ جو ہر دور میں موجود تھی، موجود ہے اور رہے گی۔ مگر جس طرح مذہب کے نام پر انھوں نے فساد، انارکی کو ہوا دی وہ نہایت افسوس کا مقام تھی، یہی صورت حال گلزار کے ان اشعار میں بھی ہے:

آگ سے پھول اُگے، اور نہ زمین سے کوئی دریا پھوٹا

نہ سمندر سے کسی موج نے پھینکا آنچل

نہ فلک سے کوئی کشتی اُتری

آزمائش کی تھی کل رات خداؤں کے لیے

کل مرے شہر میں گھر ان کے جلائے سب نے!!^(۷)

نظم کو گلزار نے جمالیاتی انداز میں علامتی پیکر سے تراشا ہے اور ایک ایسی فضا تخلیق کی، جس میں دکھ، کرب اور اذیت ہے۔ طنزیہ آہنگ کے سہارے رومانوی انداز سے اس پہلو کی جانب اشارہ کیا ہے کہ جب امیدیں دم توڑ دیتی ہیں۔ آس نراس میں بدل جاتی ہے، کوئی معجزہ بھی ظہور پذیر نہیں ہوتا، اپنی ہی صدائیں اور چیخیں، بند درپچوں سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہیں انہوں نے معاملات دہر اور کرداروں کی حرکات و سکنات کو ایک سادہ سے ترکیب بند کینوس میں پیش کیا ہے۔ جہاں ایک جانب خالق کائنات کی ذات کو براہ راست نشانہ بنایا گیا ہے تو دوسری جانب خدا اور اس کے انبیاء و پیامبر کے قصوں کے ذریعے واقعات کو زیادہ وسیع تر معنی میں پیش کیا ہے۔ ان کے استغہامیہ لہجہ میں انتہائی تلخی اور بیزاری کا اظہار ہے اور اس اظہاریت کی بے قراری اور تلخی کے پس پردہ قدیم قصوں اور حکایات کا بیان ہے جہاں ایک طرف وہ عظیم طاقت خدا کی ہے جو جی یا قیوم ہے۔ جس نے اپنے انبیاء کی حفاظت فرمائی اور انھیں مشکلات سے نکال کر نئی زندگی بخشی۔ پہلا قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود بادشاہ کا ہے جس میں آگ خدا کے حکم سے گلزار بن گئی۔ اس کا ذکر سورۃ الانبیاء اور سورۃ الصف میں ہے۔ دوسرا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعصاء موسیٰ کا ہے۔ اس کا ذکر سورۃ طہ اور سورۃ الاعراف میں ہے۔ تیسرا واقعہ نوح علیہ السلام کا ہے۔ اس کا ذکر سورۃ ہود، سورۃ الانبیاء، سورۃ الشعراء اور سورۃ الصافات میں ہے۔ گلزار نے مذکورہ مصرعوں میں انتہائی سادگی سے اُن تمام قدیم دور کے قصوں کا اعادہ کرتے ہوئے خدا سے سوال کیا کہ اُس روز انسانوں کے لیے کوئی معجزہ رونما نہ ہوا۔ اور تقسیم انہیں تلخ حالات میں تقسیم در تقسیم کرتی چلی گئی۔ انہوں نے دنیا کے اس طاقتور سامراجی نظام کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جہاں دنیاوی نام نہاد خدا اپنی طاقت کے گھمنڈ میں انسانیت کی تذلیل کرنے پر

ٹٹے ہوئے ہیں۔ انھوں نے دنیا کے اس طاقتور سامراجی نظام کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے نیشنلزم، ملکیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کس کس روپ میں دنیاوی خدا کا درجہ حاصل کر رکھا ہے۔ اور ہجرت کے مارے لوگ اپنوں کی تلاش میں خزاں کے پتوں کی مانند بکھر گئے ہیں۔ آندھیاں انہیں کہاں لے جائیں گی، وہ بے خبر ہیں لیکن دُعا گو ہیں کہ اب دل کا حجرہ نہ اجرے جس کی مصوری گلزار کے ہاں کچھ یوں نظر آتی ہے:

وہ زرد پتے جو پیڑ سے ٹوٹ کر گرے تھے کہاں گئے بہتے پانیوں میں بلائے کوئی
مزار پر کھول کر گریباں دعائیں مانگیں جو آئے اب کے تو لوٹ کر پھر نہ جائے کوئی^(۸)

دل کا حجرہ کتنی بار اجڑا بھی اور بسایا بھی ساری عمر کہاں ٹھہرا ہے کوئی ایک رہائش پر^(۹)
گلزار محسوس کرتے ہیں کہ ہجرت ایسا عبرت ناک سانحہ تھا جس نے بستیوں اور شہروں کو ہی تقسیم نہیں کیا بلکہ انسان کو احساسات و جذبات کی سطح پر بھی یوں منقسم کر دیا۔ وہ انجانے راستوں کی دھول میں گم ہو کر کشمکش اور بے چارگی کا شکار ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

یہ محض سیاسی حادثہ نہیں تھا۔ ایک عمرانی انقلاب کا پیش خیمہ تھا، ہمارے فنکار اس کے تماشائی نہیں تھے، اس طوفان سے ہو کر گزرے تھے۔ لاکھوں انسان، زمین، خاندان اور صدیوں کی روایات کا دامن چھوڑ کر نقل مکانی کر رہے تھے۔ فاقے، فساد اور نقل و حمل کی دشواریوں نے انسانی قدروں کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔ ایک بار انسان حیوان کی طرح خون چاٹ رہا تھا۔ اور مخمور دیوانی آنکھوں سے عورتوں اور بچوں پر نئی افتاد توڑنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔^(۱۰)

گلزار نے بھی دہلی میں ہونے والے واقعات کو رنج، خوف، زار و قطار آنسو بہاتی آنکھوں اور خون رنگ دھرتی کے پس منظر میں دیکھا اور انھیں اپنی ذات کے درد میں سمو کر ایسی غم و اندوہ کی کیفیات سے لبریز لمحوں کی عکاسی کی کہ جس سے ان کے فن نے جگ بیتی و آپ بیتی کی آمیزش سے نئی تاریخ رقم کی۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی میں کسی نہ کسی نفسیاتی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ منٹو کے، ”ٹوبہ ٹیک سنگھ والے“ بشن سنگھ اور اس کے دوستوں ”افضل“، ”لہنا سنگھ“، ”ودھا واسنگھ“ اور ”بھین امرت“ کو خبر کرنے کے لیے گلزار ان کے دکھوں کی پکار بن جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

مجھے واگھا پہ ٹوبہ ٹیک سنگھ والے بشن سے جا کے ملنا ہے
 سنا ہے وہ ابھی تک سوجے پیروں پر کھڑا ہے جس جگہ منٹو نے چھوڑا تھا
 وہ اب تک بڑبڑاتا ہے
 اپر دی گڑگڑ منگ دی دال دی لالٹین
 پتالینا ہے اس پاگل کا
 اونچی ڈال پر چڑھ کر جو کہتا تھا
 (۱۱)
 خدا ہے وہ

گلزار کی نظم، ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ تقسیم ہند کے پس منظر میں نئی امیجری، تجسیم کاری اور الفاظ کے برتاؤ کے لحاظ سے منفرد انداز کی حامل ہے۔ ان کی شاعری میں تحریر سے تجسیم کاری کا ایک غالب رجحان ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے جن فنی حربوں سے کام لیتے ہیں ان میں اُن کا مرغوب ترین حربہ تجسیم کاری Personification ہے۔ جس طرح منٹو نے بظاہر پاگل خانے کی فضا برپا کرتے ہوئے ایک پراسرار کیفیت کی تجسیم کاری کی تھی، بالکل اسی طرز پر گلزار نے منٹو کے کرداروں سے مستفید ہوتے ہوئے کرداروں کے ناسطجائی پن کے طفیل اپنے معاشرے اور سماج کی ترجمانی کی ہے جس میں بظاہر ان پاگل لوگوں کا ردِ عمل بڑا معنی خیز اور حیران کن لمحات سے بھرپور ہے۔ وہ منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بٹوارے کو پہلا بٹوارہ کہتے ہیں۔ لیکن دوسرا بٹوارہ جو تہذیبی و لسانی کلچر کے نام پر کیا جا رہا ہے، وہ اسے اس سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیتے ہیں۔ گلزار کا واگھا پر ٹوبہ ٹیک سنگھ والے بشن سے جا کر ملنا حقیقت میں اُس صورت حال کی تجسیم کاری ہے جس میں تقسیم کے نتیجے میں لوگ اپنی جائیدادیں اور میراث چھوڑ کر دوسرے دیس نقل مکانی کر گئے مگر انھیں اپنے حقوق نہ ملے وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ ان کا علاقہ کون سا ہے۔ ان کی پہچان کیا ہے، ان لہو لہو واقعات اور المناک حادثات و سانحات نے گلزار کی سوچ کے دھارے یکسر بدل دیے۔ انھیں تنہائی میں اپنوں کی کٹی گردنیں تڑپتے جسم، بین کرتی آوازیں بار بار یاد آتی ہیں، ان کے ہاں بے بسی اور تنہائی کا کرب اس طرح رچا بسا ہے جس طرح غالب حلقہ گرداب میں بسیرا کیے ہوئے تھا۔ انھوں نے کسی خونی رشتے سے تو ہاتھ نہیں دھویا تھا مگر وہ آج بھی اس رستے پر نظریں جمائے ہیں جو اُن کے آباؤ اجداد کی گلیوں، حویلیوں کو جاتا ہے۔ اُن کی متلاشی آنکھیں اُن راستوں کی دھول پر قربان ہیں کہ راستوں کی یہ دھول اُن کے لیے وہ سندور ہے جسے قسمت والیاں سروں پہ سجا کر سہاگن کہلاتی ہیں۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی نظم ”اُس موڑ سے“ میں کیا ہے:

اس موڑ سے جاتے ہیں کچھ ست قدم رستے
کچھ تیز قدم راہیں
پتھر کی حویلی کوشیشے کے گھروندوں میں
نتکوں کے نشیمن تک

صحرا کی طرف جا کر اک راہ گولوں میں کھو جاتی ہے چکر اکر^(۱۲)

یہاں گلزار معاشرتی نفسیات کے نباض کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ اگرچہ جسمانی طور پر دینے سے 'امر تسر' اور 'امر تسر' سے دہلی چلے گئے تھے اور وہاں سے ممبئی اور نہ جانے کن کن راہوں میں غوطہ زنی کرتے رہے مگر اُن کی روح کو قرار نصیب نہ ہو سکا۔ اُن کے نزدیک یہ سرحدی بندشیں بے معنی ہیں۔ جب اس کائنات کو بنانے والا خدا کسی سرحد، رنگ و نسل اور ذات پات کا متحمل نہیں تو انسان نے کیوں اپنی پیدا کردہ تقسیم اور سرحدوں (LOC) میں اپنے آپ کو اسیر کر لیا ہے، وہ اس سرحدی تقسیم کے خلاف ہیں لیکن برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کے درمیان ایسی تلخی اور کشیدگی نے جنم لیا کہ ایک مضبوط آتشیں سرحدی دیوار کھڑی ہو گئی، جہاں نفرتوں نے جنم لیا۔ ویزہ حاصل کرنے کے اُن گنت مسائل پیدا ہو گئے۔ ایسے میں لوگ حسرت و یاس کی تصویر بنے سوائے خوابوں میں ملنے کے اور کچھ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ گلزار کی نظم "خواب کی دستک" بھی اسی تناظر میں لکھی گئی ہے۔ خواب انسانی زندگی کی بنیادی اور واقعی ضرورت ہیں یہ زندگی کے کرب انگیز لمحوں میں گھنیری چھاؤں بن کر نہ صرف ماضی کو زندہ رکھتے ہیں بلکہ کئی ترسیدہ خواہشوں کو تکمیل کا حسن اور رنگ بخشتے ہیں اس نظم میں اُنہوں نے اپنے ارد گرد پھیلی زندگی اور اپنی خواہش کو موضوع سخن بنایا ہے اور اسے جانچنے، پرکھنے، برتنے اور بیان کرنے کے لیے جذبات کا اسلوب تشکیل کیا ہے۔ ان کی نظم اسی نئے اسلوب کی آئینہ دار ہے کہ یہ خواب بھی تخلیقی عمل کا حصہ ہیں:

صبح صبح اک خواب کی دستک پر دروازہ کھولا، دیکھا

سرحد کے اُس پار سے کچھ مہمان آئے ہیں

آنکھوں سے مانوس تھے سارے

چہرے سارے سنے سنائے

پاؤں دھوئے، ہاتھ ملائے

آنگن میں آسن لگوائے

اور تھوڑے پہ مٹی کے کچھ موٹے موٹے روٹ پکائے

پوٹلی میں مہمان مرے
پچھلے سالوں کا گڑ لائے تھے
آنکھ کھلی تو دیکھا گھر میں کوئی نہیں تھا
خواب تھا شاید!
خواب ہی ہوگا!!^(۱۳)

ایوب خاور اپنے مضمون چاند پکھراج کا ایک جائزہ میں اس خواب کا بہت دردناک تجزیہ کرتے ہیں۔
یہ خواب شاعر کی روح کے کسی درپچے میں اٹکی ہوئی سانس کی طرح جھول رہا
ہے۔ جو اگر رواں ہو جائے، تو زندگی بحال کر دے، اور اگر ٹوٹ جائے تو سب
کچھ ختم ہو جائے۔ اپنی آنکھوں سے ایسے ایسے خواب نچوڑ کر انسانی رشتوں کی
آبیاری کرنے والے شاعر کی اس نظم کا پس منظر اور پیش منظر تاریخی حقیقتیں ہیں
اور ان دونوں حقیقتوں کے درمیان ایک تنور ہے جو ابھی تک بجھا نہیں، گڑ کا ذائقہ
ہے جو ہونٹوں سے ابھی تک چپکا ہوا ہے۔^(۱۴)

یہ خواب ایک ایسا تخلیقی امر ہے جس میں گلزار کی شخصیت کی تفسیر و تشریح ہے۔ وہ آج بھی تقسیم ہونے والی
دھرتی کے خوابوں میں سانس لیتے ہیں۔ ہجرت کے حوالے سے گلزار کی شاعری میں ”دھواں“ بھی ایک خاص
علامت اور اہم پس منظر رکھتا ہے جس طرح اقبال کی شاعری میں شاہین ناصر کاظمی کے ہاں رات اور مجید امجد کی
شاعری میں شجر اور وقت اہم ہیں۔ اس طرح گلزار کی نظم و غزل میں ”دھواں“ اہم حوالہ ہے کہ گلزار کے لیے ہجرت
زدہ آسمان اور منقسم تہذیبی ورثہ، کربناک ہی نہیں اذیت ناک بھی تھا وہ وطن اور اس کی محبت کو ایمان کی حد تک
ماننے والے ادیب ہیں۔ ہجرت ان کی زندگی اور سوچ میں بے زمینی کے دھچکے کی نسبت سے منسوب ہوئی جو ان
کے داخلی کرب کی غماز ہے۔

چولھے نہیں جلانے کہ بستی ہی جل گئی کچھ روز ہو گئے ہیں اب اٹھتا نہیں دھواں
آنکھوں میں جل رہا ہے یہ بجھتا نہیں دھواں اٹھتا تو ہے گھٹا سا برستا نہیں دھواں^(۱۵)
اس سانچے میں بستیاں کی بستیاں خالی کروادی گئیں۔ زندگی کے آثار ختم ہو گئے۔ اس کا دکھ ان کے تخلیقی
وجود نے اٹھایا، وہ تہذیبی، اخلاقی اور تمدنی قدروں کا نوحہ لاپتے ہیں۔ وقت اور حالات نے کئی کروٹیں بدلیں
لیکن گلزار آج بھی پاکستان (دینہ) کو اپنا وطن اور ”ہندوستان“ کو اپنا ملک قرار دیتے ہیں۔ جو ان کی جہلم سے

جڑی یادوں، پیار بھرے لمحوں، سرمئی شاموں، ٹھنڈے میٹھے دریاؤں کے پانی اور دینہ میں 'دفن' اس 'آنول' کی وجہ سے ہے جو، جو وقت کے ساتھ کم ہونے کی بجائے گہری ہو گئی ہے۔ فسادات کے بعد عجب نفسا نفسی کا دور تھا۔ عزیز از جان رشتے پتوں کی طرح بکھر گئے تھے، موت کی دہشت انسان کے وجود میں ایسے اثری کہ پھر زندگی کی طرف لوٹنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوا۔ خوف ناک اندھیرے مہیب سناٹے کچھ اس طرح چہار سو پھیل گئے تھے کہ اب کوئی دلا سہ، کوئی خواب انھیں یقین کی منزل تک لے جانے میں ناکام نظر آیا۔ حالات کی بدترین شکل اور وطن سے دوری اذیت ناک تھی۔

نہ جانے کون سی مٹی وطن کی مٹی تھی نظر میں دُھول، جگر میں لیے غبار چلے
سحر نہ آئی کئی بار نیند سے جاگے سو رات رات کی یہ زندگی گزار چلے^(۱۶)
ڈاکٹر اعجاز حسن لکھتے ہیں:

فسادات کے موضوع پر لکھتے ہوئے گلزار نے جس کرب سے انسان کی سیاہ کاریوں اور وحشیانہ حرکتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اُس میں اس کی درندگی اور سفاکی سے وہ بہت مایوس نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ اس عذاب سے نکل نہیں پاتے۔ ہجرت نے اُن کے قلب و ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ قتل و غارت گری کی المناک تاریخ کا ذکر اس میں کیا ہے۔^(۱۷)

زندگی کے دکھوں اور تباہی و بربادی کا گلہ میر، درد، عدم، غالب، داغ، ناصر کاظمی، ساغر صدیقی، فیض، محسن نقوی اور احمد ندیم قاسمی نے بھی کیا ہے لیکن جو کرب ناک دل سوز بیانیہ گلزار کی ساری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اُس سے دکھ کرب اور فکر و احساس کی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ آزادی کے بعد موسم گل زخمی زخمی تھا۔ ہوائیں بادی موسمی تھیں۔ ہر سو قہر ناک ویرانی اور تاراجی کا دور دورہ تھا۔ فسادات کے موضوع پر لکھتے ہوئے گلزار نے جس اذیت سے انسان کی سیاہ کاریوں کا تذکرہ کیا ہے اُس سے اُن کی آواز سماج میں موجود ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بن کر ابھرتی ہے۔ اُنہوں نے عمیق مشاہدے سے تمام حالات کا تجزیہ کیا ہے کہ جہاں اب سارے تعلقات مذہب کی تفریق اور فسادات کی آگ میں بھسم ہو گئے۔ اُمید کی کرن دم توڑ چکی تھی۔ گلزار ہجرت کے موضوع پر لکھتے ہوئے تخلیق کے اذیت ناک لمحوں سے گذرے۔ ہجرت ان کی زندگی میں بے زمینی کے دھچکے سے منسوب ہوئی۔ عدم شناخت گلزار کا وہ کرب ہے جو ہجرت کے ساتھ جڑا ہوا ہے، حالاں کہ وہ ایسے ادیب ہیں کہ جو بطور فلم نگار، گیت نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، ہدایت کار اور شاعر کی حیثیت شہرت کی بلندیوں کو چھو چکے ہیں۔ ملکی سطح پر

بڑے بڑے ایوارڈز کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر بھی ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ ممبئی (بوسکیانہ) میں بہت خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ قسمت کی دیون اُن پر مہربان ہے۔ لیکن آج بھی اُن کی یادوں، محبتوں، خوابوں، خواہشوں اور دلی تمناؤں کا مرکز و محور پاکستان کی سرزمین جہلم (دینہ) ہے۔ جو اُن کے لیے مقدس و محترم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر رات اپنی تصوراتی دنیا بساتے ہیں اور ”دینہ“ کے گلی کوچوں کا طواف کرتے ہیں۔ کہ تخیل کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، اور آنکھوں کو ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس کا اظہار وہ اس ترویجی میں کرتے ہیں:

میں سب سامان لے کر آ گیا اس پار سرحد کے
مری گردن کسی نے قتل کر کے اس طرف رکھ لی
اُسے مجھ سے بچھڑ جانا گوارا ہی نہ تھا شاید^(۱۸)

محرومی اور نارسائی کی اذیت ان کی بے قرار روح کو نامتناہی تمنائوں کے سوز و گداز سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ غم اعلیٰ تخلیق کے لیے وہ محرک ہے جو قدرت خیال و وجدان ادراک جذبے اور اسلوب کا ایسا امتزاج پیدا کرتا ہے کہ ادیب کا قلم الوہی نغمے الاپتا ہے۔ گلزار کا تخیل بھی سماج کی آواز بن کر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ ان کے شعری سرمائے میں کثیر الجہتی ہے جو اُن کے اسلوبی سرمائے میں معاون و مددگار ہے۔ انھیں ۱۱ سال کی عمر میں ہجرت کے تاریخ ساز لمحے سے گزرنا پڑا۔ اُن کے فکری شعور نے اس سارے عمل کو جاگتی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا۔ یوں یہ لمحہ اُن کی یاد میں ٹھہر گیا۔ وہ تمام عمر اس کی قید سے رہائی نہ حاصل کر سکے لیکن اس دکھ اور اذیت نے انھیں گہرا شعور، فنی چنگی اور اعلیٰ بصیرت عطا کی جو انہیں معاشرے سے منفرد مقام پر فائز کرتی ہے۔ انھوں نے مدبرانہ اور مفکرانہ انداز سے اُس شب گزیدہ سحر کو موضوع سخن بنایا۔ ان کی شاعری معاشرے کے حقائق و حوادث سے پردہ اٹھاتی ہے اور عصری صورت حال کا مرقع بن کر سامنے آتی ہے۔ گلزار کے ذاتی میلانات، نظریات اور جذبات کے پس منظر میں کہیں بھی نظریاتی سطح پر تقسیم ہونے والی دھرتی کے خلاف نہیں ہیں۔ بلکہ صرف دکھ اور اذیت کی وہ طویل کہانی ہے جس سے بحیثیت حساس، ادیب وہ گذرے اور ”جہلم“ (دینہ) کی یاد اُن کی ہر تحریر میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

حواشی

۱۔ گلزار، ”چاند پکھراج کا“، (لاہور: اساطیر، ۲۰۰۶ء)، ص ۳۶۰

- ۲۔ ایضاً، (مجموعہ)، ”نظمیں، غزلیں، گیت، تروینی“، مرتبہ گل شیربٹ، (جہلم: بک کارنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۴۱
- ۳۔ ایضاً، ”رات پشمینے کی“، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۴۳
- ۴۔ ایضاً، (مجموعہ)، ”نظمیں، غزلیں، گیت، تروینی“، ص ۴۰
- ۵۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، ”جدید اردو افسانے کے رجحانات“، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۵۵
- ۶۔ گلزار، ”رات پشمینے کی“، ص ۳۹
- ۷۔ ایضاً، ص ۴۰
- ۸۔ ایضاً، ”چاند پکھراج کا“، ص ۲۳۱
- ۹۔ ایضاً، ص ۲۴۵
- ۱۰۔ ڈاکٹر محمد حسن، ”روح تنقیدی ادب“، (لاہور: ادارہ ادب و تنقید، سن)، ص ۳۶
- ۱۱۔ گلزار، ”رات پشمینے کی“، ص ۱۲۸-۱۲۷
- ۱۲۔ ایضاً، ”چاند پکھراج کا“، ص ۱۶۳
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۴۴-۴۵
- ۱۴۔ ایوب خاور، ”چاند پکھراج کا (ایک جائزہ)“، مشمولہ ”کولاز“ شمارہ ۵، (کراچی: کولاز پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۰۹-۱۱۰
- ۱۵۔ گلزار، ”رات پشمینے کی“، ص ۱۹۰-۱۹۱
- ۱۶۔ ایضاً، ”چاند پکھراج کا“، ص ۲۶۰
- ۱۷۔ ڈاکٹر اعجاز حسین، ”مختصر تاریخ ادب اردو“، (سندھ: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء)، ص ۴۱۲
- ۱۸۔ گلزار، ”تروینی“، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۹۶

ماخذ

- ۱۔ حسن، محمد، ڈاکٹر، ”روح تنقیدی ادب“، لاہور: ادارہ ادب و تنقید، سن
- ۲۔ حسین، اعجاز، ڈاکٹر، ”مختصر تاریخ ادب اردو“، سندھ: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء
- ۳۔ قزلباش، سلیم آغا، ڈاکٹر، ”جدید اردو افسانے کے رجحانات“، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء)
- ۴۔ گلزار، ”چاند پکھراج کا“، لاہور: اساطیر، ۲۰۰۶ء
- ۵۔ _____، (مجموعہ)، ”نظمیں، غزلیں، گیت، تروینی“، مرتبہ گل شیربٹ، (جہلم: بک کارنز، ۲۰۱۴ء)
- ۶۔ _____، ”رات پشمینے کی“، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء
- ۷۔ _____، ”تروینی“، _____، ۲۰۱۵ء

ماخذ

- ۱۔ ”کولاز“ شمارہ ۵، (کراچی: کولاز پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)

